نورالحسن راشد کاندھلوی *

دہلی کے ایک نامور عالم اور استاد اور تحریک ۱۸۵۷ء کے ایک مجاہد مولانا نوازش علی دہلوی مہاجر مکی

(جو حالی کی روایت کے مطابق سرسید احمد خاں کے استاد بھی تھے)

احوال وتعارف:

مولانا نوازش علی جو دہلوی نسبت سے مشہور ہیں ان کا آبائی وطن (موجودہ صوبہ ہریانہ کے مشہور تاریخی شہر) کیتھل (Kaithal) ضلع کرنال کا ایک گاؤں ہابڑی تھا۔[1] مولانا کے خاندان ونسب اور خانوادہ کا دینی علمی معاشی پس منظر تو دور کی بات ہے۔ افسوس ہے کہ مولانا کے والد کا نام بھی معلوم نہیں ہے، پڑھنے کے لیے دہلی آئے، پھر وہیں کے ہو رہے۔ زندگی کا اکثر وقت دہلی میں درس وافادہ میں گزرا اور جب دہلی میں مولانا مفتی صدر الدین آزردہ، مولانا مملوک العلی نانوتوی اور مولانا محمد حیات جیسے علما کے علم وفضل کا ڈنکا بج رہا تھا اور ان کی تعلیمی محفلوں اور درس وافادہ کی وسیع وعظیم مجلسوں کی وجہ سے دہلی کی شہرت ملک کے کونے کونے میں باقی تھی اس وقت ایک بڑا اور معروف حلقہ درس مولانا نوازش علی صاحب کا بھی تھا۔ دینی علوم اور معقولات وغیرہ کے طلبا میں دہلی کے لیے جو ایک کشش تھی اس میں اور اسباب وعلما کے علاوہ ایک وجہ کشش مولانا نوازش علی کی مجلس تعلیم کی حاضری بھی تھی، بہت سے اصحاب مولانا کے حلقہ درس سے فیض یاب ہوئے، حالی سرسید کے استادوں میں ایک نام مولوی نوازش علی صاحب کا بھی لیتے ہیں اور خود الطاف حسین حالی نے بھی مولانا کے حلقۂ درس سے بہت فیض حاصل کیا ہے۔

بعد میں جب دہلی میں مدرسہ حسین بخش قائم ہوا تو مولانا نوازش علی اس کے صدر مدرس بنائے گئے اور دہلی میں صدر المدرسین کے نہایت ممتاز لقب سے مشہور و مفتخر ہوئے اور جب ۱۸۵۷ء کی تحریک برپا ہوئی اس میں بھی مردانہ وار حصہ لیا، اس کے بعد کے حالات کی وجہ سے دہلی سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تھے وہیں وفات پائی۔

افسوس ہے کہ دہلی کی تاریخ اور علمائے ہند کے تذکروں میں مولانا کا بہت کم برائے نام سا ذکر آیا ہے۔ تعجب ہے کہ حالی نے بھی مولانا کو نظر انداز کیا ہے، جن کے فیض صحبت سے انھوں نے علم اور یہ صلاحیت حاصل کی تھی۔ آئندہ سطور میں مولانا کے حالات پر غالباً پہلی مرتبہ کسی قدر تفصیل سے لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

---

* مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، کاندھلہ، مظفر نگر۔ ۲۴۷۷۷۵ (یوپی) انڈیا

سنہ ولادت اور تعلیم:

مولانا کے خاندان ونسب اور سنہ ولادت کا کہیں تذکرہ نہیں ملا، لیکن سرسید احمد خاں نے جو مولانا سے ذاتی طور پر واقف تھے اور حالی کے بقول سرسید احمد خاں کے استاد بھی تھے لکھا ہے کہ مولانا حضرت شاہ محمد اسحاقؒ کے شاگرد تھے، دوسری روایات واطلاعات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں تقریباً ۱۲۶۱ھ میں مولانا نوازش علی صاحب کا حلقۂ درس خاصا معروف تھا اور اس میں طلبا کا جم گھٹا رہتا تھا، ان دونوں روایتوں پر غور کر کے بعض نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں، حضرت شاہ محمد اسحاقؒ ذی قعدہ ۱۲۵۸ھ (دسمبر ۱۸۴۲ء) میں دہلی سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہوگئے تھے اور مولانا کا حلقہ درس تقریباً ۱۲۶۲ھ۔۱۲۶۱ھ تک خاصا مشہور ہو چکا تھا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نوازش علی بہ ظاہر حضرت شاہ محمد اسحاقؒ کے آخری دور کے شاگردوں میں سے ہیں، لیکن بالکل آخری عہد کے نہیں۔ مولانا نے غالباً ۱۲۵۰ھ سے ۱۲۵۵ھ (مطابق ۱۸۳۹ء۔۱۸۳۵ء) کے درمیان کسی وقت حضرت شاہ صاحب سے پڑھا ہوگا اور چوں کہ اس دور میں ممتاز ترین علما کی خدمت میں آخری درس کی حاضری اور صحیحین (بخاری ومسلم) کے سبق خاصی عمر میں ہوتے تھے، اس لیے اگر شاہ صاحب کی خدمت میں حاضری کے وقت مولانا کی عمر پچیس چھبیس سال بھی ہو تو مولانا کی ولادت تقریباً ۱۲۲۵ھ سے ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۶ء۔۱۸۱۰ء) کے درمیان ہوئی ہوگی، تعلیم کا بھی مفصل حال معلوم نہیں۔ سرسید احمد خاں نے صرف یہ لکھا ہے کہ:

''شاہ جہاں آباد کے علما کی خدمت میں کتب تحصیل کو حاصل کیا اور حدیث نبوی کو حضرت بابرکت مولوی محمد اسحاق محدث دہلوی غفر اللہ لہ سے پڑھا''۔[۲]

دہلی کے علما میں وہ کون سے اصحاب تھے جن سے مولانا نوازش علی صاحب کو تلمذ واستفادہ کا موقع ملا، اس کی تفصیل بلکہ ان علمائے کرام کے نام بھی راقم سطور کو دستیاب نہیں ہوئے، آخر میں حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حدیث پڑھی اس تلمذ و استفادہ کا عہد بھی معلوم نہیں قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۵ء۔۱۸۳۴ء) یا اس کے قریب اس کا موقع ملا ہوگا۔

تعلیم وتدریس:

مولانا نوازش علی صاحب خاندان ولی اللٰہی کے علما اور اپنے استاد حدیث شاہ محمد اسحاق کے طریقہ کے مطابق غالباً تعلیم کے بعد ہی سے تدریس میں مشغول ومتوجہ ہوگئے تھے۔ مولانا نے تعلیم کی ابتدا کہاں سے کی اور اس میں کس طرح ترقی ہوئی اور کون کون سے طلبا مولانا کی خدمت میں حاضر رہتے تھے اس کی روداد دستیاب نہیں، لیکن جس وقت حضرت مولانا مملوک العلی دہلی کے محلّہ کوچہ چیلان میں مقیم تھے اور مولانا کی خدمت میں اور طلبا کے علاوہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بھی تعلیم وتربیت کے لیے حاضر رہتے تھے اس وقت مولانا نوازش علی صاحب کا درس قوت سے جاری تھا۔ مولانا نوازش علی کا مولانا مملوک العلی کے گھر کے قریب ہی (کھجور والی) مسجد میں قیام تھا[۳] اور مولانا کی فیض مآبی کی بدولت مولانا نوازش علی کی مسجد میں بھی طلبا کا ہجوم رہتا تھا اور جیسا کہ زمانہ کا دستور ہے کہ ہر جگہ ہر دور میں دو مدرسوں کے طلبا میں ایک دوستانہ مقابلہ آرائی، ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش اور ایک دوسرے مدرسہ کے طلبا کی تعلیم پر طرفین کے تبصرے اور دوستانہ چھیڑ چھاڑ ہوتی رہتی ہے ایسا ہی کچھ حضرت مولانا مملوک العلی کے شاگردوں اور مولانا نوازش علی صاحب کے مدرسہ کے طلبا میں بھی رہتا تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب حضرت مولانا مملوک العلی کی خدمت میں دہلی تعلیم کے لیے حاضر

ہوئے تو اپنی غیر معمولی ذہانت وفطانت کی وجہ سے استاد محترم کی آنکھ کی ٹھنڈک اور دوسرے اساتذہ وطلبا کے لیے رشک وامتحان کا سامان بن گئے تھے۔ مولانا کی لیاقت و قابلیت کا چرچا ہوا تو مولانا نوازش علی کے مدرسہ کے طلبا نے مولانا کا امتحان لینے اور شاید مولانا کو زک دینے کا ارادہ کرلیا۔ مگر جب اس خیال سے مولانا محمد قاسم صاحب سے رابطہ اور بحث وگفتگو ہوئی تو مولانا غالب آئے۔ اس واقعہ اور مولانا نوازش علی کے مدرسہ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا محمد یعقوب نے لکھا ہے:

''اسی زمانہ میں ہمارے مکان سے مولوی نوازش علی کی مسجد میں مجمع طالب علموں کا تھا ان سے پوچھ تاچھ اور بحث شروع ہوئی، مولوی صاحب کی جب باری آئی سب پر غالب آئے اور جب گفتگو ہوئی اس میں مولوی صاحب کو غلبہ ہوتا بلکہ ہم میں سے جو کوئی مغلوب معلوم ہوتا مولوی صاحب سے مدد چاہتا یا مولوی صاحب خود اس کو مدد دیتے پھر تو مولوی صاحب ایسا چلے کہ کسی کو ساتھ ہونے کی گنجائش نہ رہی''۔ ۴

یہ تو حضرت مولانا نانوتوی کی اعلیٰ علمی استعداد اور وہبی صلاحیت کی بات تھی، لیکن اس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ مولانا نوازش علی صاحب کی مسجد مولانا مملوک العلی کے گھر کے قریب تھی اور حضرت مولانا مملوک العلی کے مکان اور حلقۂ درس کی طرح مولانا نوازش علی صاحب کی مسجد میں بھی طالبان علوم کی مجمع اور جم گھٹا لگا رہتا تھا اور دونوں علما کے شاگردوں میں باہمی ملاقاتیں اور روابط رہتے تھے اور دونوں حلقوں کے منتسبین میں دوستانہ بحث ومباحثہ ہوا کرتا تھا اور مقابلہ آرائی جاری رہتی تھی۔

قرین قیاس ہے کہ حضرت مولانا مملوک العلی کی وفات (۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء) کے بعد مولانا نوازش علی کی مرجعیت اور شاگردوں کی تعداد میں وسیع وکثیر اضافہ ہوا ہوگا۔ حضرت مولانا مملوک العلی کی وفات کے ایک سال بعد ہی دہلی کی پنجابی برادری کے ایک مخیّر تاجر شیخ حسین بخش نے قدیم رؤسا اور اہلِ خیر کی طرح اپنے ذاتی صرفہ سے دہلی میں ایک بڑا مدرسہ قائم کیا، جس میں درس وتعلیم کے علاوہ طلبا کی رہائش کا بھی معقول انتظام تھا اور اسی کے احاطہ میں ایک مسجد بھی بنوادی تھی۔ یہ مدرسہ، مدرسہ حسین بخش کے نام سے آج بھی موجود ومعروف ہے۔ ۵

شیخ حسین بخش نے مولانا نوازش علی کو اپنے اس مدرسہ کا مدرس اول یا صدر مدرس تجویز کیا اور یوں مولانا کا وہ دریائے فیض جوان کے محلّہ کی مسجد سے جاری تھا اس کا ایک دھارا مدرسہ حسین بخش میں بھی بہنے لگا۔ مدرسہ حسین بخش سے مولانا نوازش علی کی وابستگی کس نوعیت کی تھی، تنخواہ مقرر تھی یا فی سبیل اللہ اسی طرح پڑھاتے تھے جس طرح اپنے مدرسہ اور گھر پر خدمت انجام دیتے تھے۔ مدرسہ سے وابستگی کے بعد گھر کے حلقۂ درس کا کیا ہوا، کچھ معلوم نہیں۔ تاہم مولانا نے تقریباً پانچ سال تک اس مدرسہ کی خدمت انجام دی۔ اسی خدمت اور علمائے دہلی میں احترام ومنزلت کی وجہ سے مولانا کو صدر المدرسین کہا اور لکھا جاتا تھا:

"صدر المدرسین الذی تزینت بتدریسة المدارس والمساحد الحبر النبیل، والکامل الکمیل، المفضل بفضل الاحلی المولوی نوازش علی"۔ ۶

مولانا اس خدمت میں مشغول تھے کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک اور جہاد کی معرکہ آرائی شروع ہوگئی بہت سے علما کی طرح حضرت مولانا بھی اس کے ہم نوا تھے اور خود بھی ایک بڑے معرکہ میں اپنے متوسلین ومعتقدین کی بڑی تعداد کے ساتھ شامل ہوئے تھے۔

مدرسہ حسین بخش کی مستند احوال اوراس کی قدیم رودادیں دستیاب نہیں، اس لیے مدرسہ میں مولانا کی مصروفیات کا حال مولانا کی زیر درس کتابوں اوران کتابوں کے اسباق میں شریک طلبا کے نام معلوم نہیں اوراس کا بھی سراغ نہیں ملا کہ مولانا نوازش علی صاحب نے مدرسہ حسین بخش سے وابستگی کے بعد اپنے گھر کے درس کا سلسلہ کس قدر باقی رکھا اور مدرسہ کے اسباق سے فارغ مولانا کے اوقات کس مصروفیت میں گزرتے تھے، اس کا تذکرہ بھی دریافت نہیں۔

وعظ وتلقین کا معمول:

مولانا نوازش علی دینی خدمات ومصروفیات میں ایک بڑی خدمت ومصروفیت وعظ نصیحت کی بھی تھی، مولانا اکثر دینی مجلسوں میں غالباً پابندی سے وعظ کہتے تھے جن کی عوام میں مقبولیت اورشہرت تھی۔ مولانا کی یہ مجلس وعظ ایسی مقبول ہوئی کہ مولانا گھروں پر بھی وعظ وتقریر کے لیے بلائے جاتے۔گھروں کے علاوہ اورمقامات پر بھی مدعو کیے جاتے تھے۔ اندازہ یہ ہے کہ مولانا اس دور میں دہلی کے مشہور اورمقبول ترین واعظ ومقرر تھے اورقرین قیاس ہے کہ اس وعظ وتبلیغ کا خاصا دینی فائدہ بھی ہوتا ہوگا۔سرسید احمد نے (جو مولانا سے ذاتی طور پر خوب واقف اورمولانا کی مجالس وعظ وارشاد سے آگاہ تھے) ان مجلسوں کی مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ازبس کہ طبیعت ہدایت وارشاد کی طرف مائل ہے اکثر اوقات مجلس وعظ بھی ان کے یہاں منعقد ہوتی ہے اورساکنین شہر شاہ جہاں اکثر بشوق اہتداو استرشاد وعظ کہنے کے واسطے اپنے اپنے گھر میں ان کو تکلیف دیتے ہیں۔ خلق وحلم میں یگانۂ روزگار اورقناعت وتوکل میں شہرہ آفاق ہیں''۔[۷]

حالی نے بھی مولانا کو دہلی کا ایک واعظ قرار دیا ہے[۸] اور ۱۸۵۷ء کی تحریک کے زمانہ کے انگریز کے مخبر بھی مولانا کی اس شہرت اوراس کے اثرات کی خبر دیتے ہیں۔[۹]

درس کے حلقوں اورمجالس وعظ کی وجہ سے مولانا کے ماننے والوں کی بڑی تعداد تھی، اسی مقبولیت وتاثیر کی وجہ سے مولانا کی ایک آواز پر ہزاروں افراد مولانا کی قیادت میں جہاد کے لیے تیار ہوگئے تھے۔

سرسید احمد خاں کے اصرار پر رہتک کے سفر کی ایک اطلاع:

تعلیم کے مکمل کرنے کے بعد ۱۸۵۷ء کی تحریک کی ناکامی تک مولانا نوازش علی صاحب کا تقریباً تمام وقت دہلی میں تعلیم اوروعظ ونصیحت کی مصروفیات میں گزرا، اسی درمیان کسی وقت چند دنوں کے لیے حالی کی اطلاع کے مطابق سرسید احمد کے اصرار پر رہتک بھی گئے تھے۔ اس ملازمت وقیام کی تفصیلات بھی ہم دست نہیں لیکن حالی نے (اس وقت کے جامع مسجد دہلی کے امام) سید محمد دہلوی[۱۰] سے نقل کیا ہے کہ میں اور سرسید احمد دونوں ہم سبق تھے اوردونوں مولوی نوازش علی صاحب سے پڑھتے تھے:

''جس زمانہ میں سید صاحب دہلی سے رہتک بدل کرگئے ہیں میں بھی ان کے ساتھ گیا تھا، وہ صبح سے دس بجے تک مولوی نوازش علی سے جن کو دہلی سے ہمراہ لے گئے تھے، سبق پڑھتے تھے''۔[۱۱]

حالی کے الفاظ سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک مختصر سفر تھا جو چندروز کے لیے ہوا تھا مگر یہ کس وقت ہوا تھا، حالی نے اس کا ذکر نہیں کیا۔سرسید احمد عارضی تقرر پر دو مرتبہ رہتک گئے دونوں مرتبہ قائم مقام امین کی حیثیت سے گئے تھے، دونوں ہی مرتبہ جلد واپسی ہوگئی تھی۔ پہلی بار ۱۸۵۰ء (۱۲۶۶ھ) میں دوبارہ ۱۸۵۳ء (۱۲۶۹ھ-۱۲۷۰ھ) میں دوسرا تقرر یا سفر صرف ایک مہینہ کے لیے ہوا تھا، اس وقت سرسید احمد نے رہتک میں اپنے رہنے کے لیے علیحدہ مکان

بھی نہیں لیا تھا۔ منشی غلام نبی میرٹھی کے مکان پر رہے تھے جو رہتک کلکٹری میں نائب سرشتہ دار تھے[۱۲] امام صاحب جامع مسجد کی جو روایت ہے اس میں صراحت ہے کہ مولوی نوازش علی کے ساتھ ان کے شاگردوں کی کثیر جماعت تھی جو سرسید احمد خاں کی رفاقت میں ہی اور سرسید احمد نے ان کے تمام مصارف برداشت کیے اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ مولوی نوازش علی کا رہتک کا سفر سرسید احمد کے رہتک کے پہلے سفر ۱۸۵۰ء کے موقع پر ہوا ہوگا۔

سرسید احمد کے دوسرے سفر رہتک ۱۸۵۳ء (۱۲۷۰ھ۔۱۲۶۹ھ) کے وقت سرسید احمد کا مولانا نوازش علی سے ساتھ چلنے کی گزارش کرنا اور مولانا کا سرسید احمد خاں کی فرمائش کو ماننا اور سرسید احمد خاں کے سفر رہتک میں ساتھ رہنا اس لیے بھی ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مولانا نوازش علی کی ذمہ داریوں میں مدرسہ حسین بخش کی صدر مدرسی کا اضافہ ہوگیا تھا اور یہ متوقع نہیں کہ مولانا نوازش علی مدرسہ کے تمام طلبا کو بھی ساتھ لے گئے ہوں، کیوں کہ جو طلبا مولانا نوازش علی صاحب سے پڑھتے ہوں گے جس سے ان علما اور استادوں کا نظام الاوقات متاثر ہونا یقینی تھا اور مولانا نوازش علی صاحب نے سرسید احمد خاں کی خوشنودی یا ان کو چند سبق پڑھانے کی خاطر متعدد علما کے مشترکہ نقصان کو گوارہ نہ کیا ہوگا، اگر طلبا ساتھ نہیں گئے ہوں گے تو وہ مولانا نوازش علی سے جو سبق پڑھتے تھے ان کا حرج لازمی تھا اس لیے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اگر مولانا سرسید احمد خاں کی دعوت پر رہتک گئے ہوں گے تو یہ سفر ۱۸۵۱ء میں پہلے عارضی تقرر کے موقع پر ہوا ہوگا۔

حالی نے سرسید احمد خاں کی تعلیم کے احوال میں مولانا سے سرسید احمد خاں کے تلمذ کا ذکر کیا ہے سرسید احمد نے مولانا سے کیا پڑھا اور حالی کی اس روایت پر کس قدر اعتماد کیا جاسکتا ہے، اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

تحریک ۱۸۵۷ء میں شرکت اور اس کی قیادت:

مولانا اپنے معمول کے مطابق درس اور دیگر علمی کاموں میں مشغول تھے کہ ۱۸۵۷ء (۱۲۷۳ھ) میں انگریز کے خلاف ایک بڑی مسلح جدوجہد کا آغاز ہوگیا اور اس کی صدائیں دہلی کی گلی کوچوں میں پھیل گئیں۔ ہر چند کہ مولانا ایک بڑے دینی کام میں لگے ہوئے تھے، مگر ان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اس جدوجہد سے یکسو رہیں، مولانا نے مجمعوں میں تقریریں فرمائیں، عوام کو جہاد کے لیے تیار کیا، عسکری دستوں کی تشکیل کی اور خود اس کی رہنمائی اور قیادت بھی کی، اگرچہ مولانا کے اس تاریخی فتوے پر دستخط نہیں ہیں جو علمائے دہلی نے مشترکہ طور پر جاری کیا تھا[۱۳] لیکن عملی جدوجہد کے بھرپور تعاون اور ذاتی طور سے اس کے شریک رہے۔

مولانا اس کارواں میں کب شریک ہوئے، شروع سے اس کے معاون و مددگار تھے یا بعد میں تعاون کیا اس کی تفصیل سامنے نہیں، لیکن دہلی پر قبضہ سے چند دن پہلے معرکہ آرائی کے آخری دنوں میں مولانا بطور خاص متحرک تھے، وقائع نویسوں نے مولانا کی جامع مسجد میں جہاد کے لیے تقریر، اس کے اثرات اور مولانا کے دو ہزار معتقدین کی جہاد میں شرکت اور کشن گنج کی طرف سے انگریزی مورچہ پر حملہ کا مختصر ذکر کیا ہے۔

مگر اس وقت جب حریت کے پروانے اور لاکھوں افراد سر سے کفن باندھے ہوئے غیر ملکی حملہ آوروں کے خلاف سینہ سپر تھے اور جانیں دے دے کر اس کے تسلط سے آزاد ہونے کی جدوجہد کر رہے تھے اس وقت ملک و ملت کے کئی غدار نیز وطن کے دشمنوں اور ضمیر فروشوں کی ایک جماعت اپنے مفادات کی خاطر انگریزوں سے سودا کیے ہوئے تھی، یہ انگریزوں کے مخبروں اور جاسوسوں کا ایک مختصر مگر منظم گروہ تھا (جس میں ہندو مسلمان دونوں شامل

تھے) جو دہلی شہر کی اندرونی ہل چل اور ایک ایک نقل و حرکت کی (خفیہ مراسلات اور تحریروں کے ذریعہ سے) انگریزوں کو اطلاع پہنچا رہا تھا، ان کا سرِ گروہ مولوی رجب علی (شیعہ) تھا، جس نے ہر طرف جال بچھا رکھا تھا۔ اسی گروہ کے ایک مخبر گوری شنکر کی تحریر اور اس وقت کے ایک نادر روزنامچہ سے مولانا نوازش علی کی مجاہدانہ سرگرمیوں کی اطلاع ملتی ہے۔

دہلی میں مہینوں تک انگریزوں سے سخت معرکہ آرائی رہی، مجاہدین نے فوجی ضرورت سے دہلی کو چار حصوں میں بانٹ دیا تھا، ہر ایک حصہ کے لیے ایک کمان اور علاحدہ نظام تھا، اسی نظام کے مطابق مولانا نوازش علی اور مولانا کے معتقدین کشن گنج کی لڑائی میں شریک ہوئے تھے یہ معرکہ ۱۱رستمبر ۱۸۵۷ء (۲۱رمحرم ۱۲۷۴ھ) کو برپا ہوا تھا۔ گوری شنکر نے اپنے خفیہ مراسلہ (مکتوبہ ۱۲رستمبر) میں اس کا یوں ذکر کیا ہے:

> ''کل کی لڑائی میں دہلی کے شہری بھی شریک تھے۔ ان میں تھانیسر کے ایک گاؤں ہتمری کا باشندہ مولوی نوازش علی بھی اپنے دو ہزار پیروکاروں سمیت تھا۔ باغی فوج کے سپاہیوں نے جنگ میں لڑکر شہید ہونے کا اقرار لیا ہے''۔[۱۴]

اس معرکہ کی کسی قدر تفصیل ایام غدر کے ایک اور روزنامچہ سے معلوم ہورہی ہے ۔ ۱۱رستمبر کو جمعہ کے دن مولانا نوازش علی صاحب اور مولانا فرید الدین دہلوی نے جامع مسجد میں وعظ وتقریر کی اور کہا کہ انگریزوں نے علی گڑھ میں سب مسلمانوں کو قتل کردیا ہے، اگر دہلی پر قابض ہوگئے تو وہ یہاں بھی وہی کریں گے جو علی گڑھ میں کیا ہے، اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ سب متحد ہوکر انگریزوں کا مقابلہ کریں اور ان پر ایک مشترکہ حملہ کردیں۔ مولانا کی تقریر کا خاص اثر ہوا، ایک بڑی تعداد نے مولانا کی آواز اور دعوت پر لبیک کہا اور اس تقریر کے تھوڑی دیر بعد کئی ہزار مسلمان ہتھیاروں سے مسلح اور تیار ہوکر آگئے اور انھوں نے مولانا کی قیادت میں کشن گنج کی طرف سے انگریزی مورچہ پر حملہ کیا۔ اس معرکہ آرائی میں آٹھ مسلمان شہید اور سترہ زخمی ہوئے تھے۔ روزنامچہ نویس نے لکھا ہے کہ:

> ''۱۱رستمبر جمعہ کا دن تھا تمام مسلمان نمازِ جمعہ ادا کرنے جامع مسجد گئے۔ مولوی فرید الدین اور مولوی نوازش علی نے باہم مشورہ کرکے جماعت سے کہا کہ انگریزوں نے تمام مسلمانوں کو علی گڑھ میں قتل کردیا ہے۔ اگر دہلی میں بھی فتح یاب ہوئے تو ایسا ہی کریں گے۔ لہذا لازم ہے کہ سب مسلمان ایک من اور ایک تن ہوکر انگریزوں پر حملہ کرو۔ چنانچہ کئی ہزار مسلمانوں نے اپنے تئیں تلوار اور کٹار اور توڑہ دار بندوق سے مسلح کیا اور واسطے حملہ آوری ایک ہزار فرنگی، کشن گنج کی جانب روانہ ہوئے لیکن کوئی دو چار ہی گراب انگریزوں کے مورچوں سے سر ہوئی تھی کہ سب لوگ منتشر اور متفرق ہوکر شہر کو لوٹے اور منجملہ ان کے ۸ آدمی مارے گئے اور سترہ مجروح ہوئے''۔[۱۵]

یہ کارروائی انگریزوں کے خلاف مورچہ بندی کے آخری دنوں کی ہے، اس کے چند ہی روز کے بعد غداروں کی سازشیں برآئیں، ہزاروں جانوں کی قربانی اور لمبی کوشش کے باوجود وطن دوست مجاہدین ناکام ہوگئے۔ اور انگریز فصیل کی دیوار توڑ کر شہر میں داخل ہونے میں کامیاب ہوئے۔ اس طرح ان کا دہلی شہر پر ۲۴رستمبر ۱۸۵۷ء، ۵رصفر ۱۲۷۴ھ کو قبضہ ہوگیا۔

مجاہدین کی پسپائی اور دہلی پر انگریزوں کا مکمل قبضہ اس بات کا گویا اعلان تھا کہ اب اس شہر میں ان اشخاص کے لیے کوئی جگہ اور گنجائش باقی نہیں جو انگریز کے خلاف

کسی بھی درجہ متحرک وسرگرم تھے۔ یہی نہیں بلکہ جن لوگوں پر مجاہدین کی معمولی حمایت کا بھی شبہ ہو جاتا تھا ان کو سزا دی جاتی، جو ملتا دار پر لٹکا دیا جاتا، جو ہاتھ آتا اس پر فائر کھول دیا جاتا، یہ سزائیں ایسی لاپرواہی سنگ دلی اور بے دردی سے دی گئیں کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گیا۔ ہزاروں ناکردہ گناہ موت سے ہم کنار ہوئے اور ہزاروں لاکھوں اشخاص گھر سے بے گھر اور وطن سے بے وطن ہونے پر مجبور ہوئے۔

مولانا نوازش علی کا شمار تحریک کے سرکردہ علما اور جنگی معرکہ آرائی کی قیادت کرنے والوں میں ہو گیا تھا، ان کے لیے دہلی یا اس کے نواح میں کہاں جائے پناہ تھی اس لیے وہ بھی کسی نہ کسی طرح زندہ بچ کر دوسرے سینکڑوں ہزاروں علما اور عوام کی طرح دہلی سے باہر نکلے اور ہندوستان سے رخصت ہو کر ہجرت کی نیت سے مکہ معظمہ پہنچ گئے۔

مولانا دہلی سے کب روانہ ہوئے، کس علاقہ سے سفر کیا، رفیق طریق کون کون تھے اور کس وقت مکہ معظمہ پہنچے پیش نظر ماخذ ان سوالات کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔ تاہم مولانا مکہ معظمہ پہنچ گئے تھے اور ہجرت کی نیت سے گئے تھے، اس کا نواب صدیق حسن کی متعدد تالیفات میں ذکر آیا ہے۔ نواب صاحب نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں ذی الحجہ ۱۲۶۹ھ (ستمبر ۱۸۵۳ء) میں دہلی آئے تھے۔ نواب صاحب نے اپنے عہد طالب علمی کی سرگزشت اور اس وقت دہلی میں موجود ایسے علما کا تذکرہ کرتے ہوئے (جن سے نواب صاحب کی ملاقاتیں ہوئیں) مولانا نوازش علی صاحب کا بھی ذکر کیا ہے۔

نواب صدیق حسن کی تالیفات میں جہاں بھی یہ تذکرہ ہے وہاں مولانا کے نام کے ساتھ مہاجر مکی کا لاحقہ موجود ہے۔[۱۶] جس سے جھلکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مولانا ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے جانے کی اطلاع عام تھی نواب صاحب کو بھی اس کا اچھی طرح علم تھا اور اس کی تصدیق حاصل تھی۔

وفات:

مولانا نوازش علی صاحب کب مکہ معظمہ پہنچے اگرچہ اس کا تذکرہ نہیں ملا لیکن اس کی شہادت ملتی ہے کہ مولانا وسط ۱۸۶۳ء کے آخر تک مکہ معظمہ میں موجود تھے۔ یعنی مولانا نے تقریباً چھ سال بیت اللہ کے زیر سایہ گزارے۔ مکہ معظمہ میں بھی درس حدیث کا شغل رہتا تھا اور وہاں بھی طلبا اور مستفیدین حاضر خدمت رہتے تھے۔ انہی مصروفیات میں مولانا مکہ معظمہ میں تھے کہ ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۳ء) میں اجل کا پروانہ آ گیا اور مولانا سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ مولانا کی وفات کی تاریخ مرقوم نہیں لیکن ۱۲۷۹ھ میں وفات کی مصدقہ اطلاع موجود ہے، مولانا مکہ معظمہ کے قدیم اور مبارک ترین قبرستان جنت المعلیٰ میں دفن کیے گئے۔ اس وقت مولانا ذوالفقار علی نقوی سارنگ پوری مکہ معظمہ میں موجود تھے ان کے اس سفر میں مولانا نوازش علی سے ملاقات ہوئی، مولانا کے درس میں حاضر ہونے کا موقع ملا اور جب اسی دوران مولانا کی (غالباً اچانک) وفات ہو گئی تو مولانا کے جنازہ میں بھی حاضر رہے۔[۱۷]

مولانا کا ایک بڑی دینی علمی کارنامہ سنن ابوداؤد کی تصحیح وحاشیہ:

حضرت شاہ محمد اسحاق کے آخری دور کے ایک ممتاز شاگرد حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری جنھوں نے حضرت شاہ صاحب سے ہندوستان میں بھی پڑھا اور مکہ معظمہ حاضر ہو کر بھی تلمذ واستفادہ کی سعادت حاصل کی جب شاہ صاحب سے اجازت لے کر ہندوستان واپسی کا ارادہ کر رہے تھے اس وقت شاہ صاحب نے ان کو خدمت حدیث کی وصیت فرمائی تھی، لائق بلکہ فخرِ سلسلہ شاگرد نے استاد محترم کی اس نصیحت وصیت کو اس طرح یاد رکھا اور اس پر عمل اور خدمت حدیث کی ایسی مکمل اور بھرپور کوشش فرمائی جو برصغیر کی خدمت حدیث کی تاریخ میں ایک نادر مثال ہے۔

حضرت مولانا احمد علی نے درس حدیث کے علاوہ ایک بہت بڑی خدمت یہ انجام دی کہ حدیث شریف کی بنیادی کتابوں کو نہایت محنت سے تصحیح و مقابلہ کر کے اور ان پر نہایت قیمتی حاشیے لکھ کر شائع کرا دیا۔ حضرت مولانا نے سب سے پہلے صحیح بخاری کی خدمت تصحیح و اشاعت پر توجہ فرمائی۔ بخاری شریف کے متعدد پرانے نسخوں کا حرفاً حرفاً مطالعہ و مقابلہ کر کے صحیح بخاری کا مستند نسخہ تیار فرمایا۔ پھر اس پر ایسا عمدہ اور جامع حاشیہ لکھا جو بخاری شریف کی معروف شروحات اور شراح حدیث کی قیمتی آرا کا بہترین مجموعہ اور انتخاب ہے، جس میں ان تمام کتابوں اور شروحات کا گویا عطر کھینچ لیا گیا ہے۔ بخاری شریف کے ساتھ ہی سنن ترمذی پر بھی توجہ مبذول کی، شرح مسلم کو شرح نووی کے ساتھ پہلی مرتبہ شائع کیا، سنن نسائی پر غالباً اس لیے کام نہیں کیا کہ اس کا ایک نسخہ مولانا کے استاد حضرت شاہ محمد اسحاق کی تصحیح و توجہ سے شاہ صاحب کے سفر ہجرت سے پہلے شائع ہو چکا تھا۔ صحاح ستہ میں سے چوتھی کتاب جس پر برصغیر بلکہ عالم اسلام میں پہلی اشاعت حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کی ممنون کرم ہے، سنن ابوداؤد ہے۔

چوں کہ حضرت مولانا احمد علی صاحب حدیث و تفسیر کی متعدد کتابوں کی تصحیح اور حاشیہ نویسی کا کام ایک ساتھ کر رہے تھے۔ ادھر مطبع کی نگرانی اور درس و فتاوی کی مصروفیات بھی تھیں اس لیے خود حضرت مولانا کو سنن ابوداؤد پر کام کرنے کا موقع نہیں ملا، لیکن حضرت مولانا نے اس اہم کتاب کی اشاعت سے غفلت نہیں برتی بلکہ جس طرح اور کئی کام دوسرے اصحاب سے کرائے خود ان کے معین و مددگار یا سرپرست رہے، غالباً یہی صورت ابوداؤد کی اشاعت میں بھی ہوئی۔

حضرت مولانا مکہ معظمہ سے سنن ابوداؤد کا ایک نہایت عمدہ اور نہایت صحیح نسخہ لائے جس کی خاندان ولی اللہی کے علما کے نسخوں سے بھی تصحیح کی گئی تھی۔ حضرت مولانا نے اپنا قیمتی نسخہ مولانا نوازش علی صاحب کو عنایت کیا۔ مولانا نوازش علی نے اس نسخہ کو بنیاد بنا کر طباعت کی تیاری شروع فرمائی۔ متون و اصول سے عبارتوں کا مقابلہ کیا۔ اس طرح یہ نسخہ جو پہلے ہی بہت عمدہ اور اعلیٰ درجہ کا تھا ابوداؤد شریف کا صحیح ترین نسخہ ہو گیا پھر مولانا کی نگرانی میں اس کے حواشی لکھے گئے اور طباعت کا انتظام ہوا۔

مولانا محمد بن تبارک اللہ پنجابی نے اس پر حاشیہ لکھا۔ اس حاشیہ پر مولانا حافظ عبدالمجید صاحب (دہلوی) نے اضافے کیے اور (دہلی کالج کے نائب صدر مدرس) مولانا سید محمد صاحب دہلوی نے ان دونوں پر نظر ثانی فرمائی۔ دہلی کے ایک مقتدر شخص، خاں عبدالرزاق پانی پتی نے طباعت کا انصرام کیا۔ (حضرت مولانا احمد علی کے ایک شاگرد) مولانا محمد حسین فقیر بنتی دہلوی نے اس کا خاتمۃ الطبع لکھا، اس کے بعد مطبع قادری دہلی کے مالک سید عبدالقادر صاحب کی نگرانی میں اس اہم قیمتی نسخہ کی طباعت عمل میں آئی۔

اگرچہ اس نسخہ میں تذکرہ نہیں مگر اس میں مولانا نوازش علی کی خدمت کے ساتھ ساتھ جس طرح مولانا محمد بن تبارک اللہ کا ذکر ہے اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ مولانا محمد بن تبارک اللہ مولانا نوازش علی صاحب کے شاگرد ہوں گے۔

مولانا محمد حسین فقیر نے خاتمۃ الطبع میں درج بالا تمام امور کی وضاحت فرمائی ہے۔ اس کے چند اقتباسات کا مطالعہ مفید ہوگا۔ حضرت مولانا احمد علی کے نسخہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"وقد نقل متن الكتاب من اصل مصحح معتمد لمولانا الفاضل مروج كتب الحديث وسيرها ومسهلها لعباد الله، الحاج الحافظ المولوى احمد على سهارنفورى سلمه الله تعالى وادام فيوضه،

وجآء بذلك من مكة المعظمة وهو اصل صحيح لم احد له نظيرا، وقد قوبل بعدة اصول من غيره فقد جآء بحمدلله صحيحا وقداستقصیٰ فی تحصیل اسباب التصحیح من النسخ المتعددة المعتمدة المصححة واسباب التحشية والتحلية من كتب اللغات واسماء الرجال مثل الصراح والقاموس و النهايه ومختصر للسيوطی والتقريب والمغنی ومن متون الاحاديث وشروحها كالصحيحين مع شروحها والمشكوٰة وشروحها نحو المرقات واللمعات والطيبی وجامع الاصول والترمذی وموطا مالك ومشكل الاثار للطحاوی وشرح السنة وغير ذلك"۔ ۱۸

مولانا نوازش علی کی عنایات اور تصحیح ومراجعت کا یوں ذکر کیا ہے:

"فاعلموا عشائر الاخوان ومعاشر الخلان، ان هذا الكتاب المستطاب قد طبع ببذل الجهد البليغ فی اجتماع لوازم انطباعه وحصول اسباب تشريحه وتصحيحه من صدر المدرسين الذی تزينت بتدريسه المدارس والمساجد الحبر النبيل الكامل الكميل المفضل بفضل الازلی المولوی نوازش علی سلمه الله الولی "۔ ۱۹

اس کے بعد مولانا محمد بن تبارک اللہ پنجابی کی حاشیہ نویسی کی خدمت کا ذکر کیا گیا ہے اس کی بھی چند سطور ملاحظہ ہوں:

"وكل ذلك بتحشی العالم الكامل صاحب السليقة المتقی الحافظ مولانا الاوحد المولوی محمدالفنجابی سلمه الله الصمد خلف العالم المتقی المتجافی جنوبه عن مضجعه من خشية الله المولوی بارك الله برد الله مضجعه ومن نتائج جهدالبليغ حافظ القرآن المجيد عبدالحميد سلمه الوحيد"۔

بعد ازاں مولانا سید محمد دہلوی کی نظر ثانی اور اضافات کا تذکرہ ہے تحریر کیا ہے:

"صححها وحذبها بعد ما ازداد تحقيقات رشيقة وتوضيحات كثيرة وتشريحات وثيقة ببذل الجهد حتی الامكان،بالغدو والاصلان من هو فی زمرة علماء المحدثين كالشمس فی النجوم، العالم الحافظ المحدث نائب رسول من رفع السماء بغير عمد، المولوی ابواحمدالحاج المدعوبمحمد، الدهوی سلمه الله الاحد"۔ ۲۰

آخر میں مطبع اور سنہ طباعت کی ان الفاظ میں صراحت کی گئی ہے:

"وقد اهتم بطبعه اهتماماً تماماً سليم الباطن والظاهر، السيد عبدالقادر سلمه الله الاكبر فی المطبع القادری الذی نسب اليه وقد تم فی شهر شعبان ۱۲۷۲ھ"۔ ۲۱

یہ نسخہ نہایت عمدہ باریک کاغذ پر دو حصوں میں چھپا ہے۔ پہلا حصہ ۳۵۴ صفحات پر دوسرا ۳۶۲۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ دونوں جلدوں کے اکثر حصہ میں ہلکے نیلے رنگ کا کاغذ استعمال ہوا ہے۔ پہلے حصہ کے شروع میں پانچ صفحات پر فہرست ابواب ہے اور اس سے پہلے کتاب کے سر آغاز پر امام ابوداؤد کا رسالہ بنام اہل مکہ بھی شامل ہے۔

یہ نسخہ سنن ابوداؤد کے معلوم نسخوں میں صحیح ترین نسخہ شمار کیا جاتا ہے۔ عصر حاضر کے بڑے علمائے حدیث نے بھی اس نسخہ کو صحت متن کے لحاظ سے اہم اور صحیح ترین نسخہ قرار دیا ہے۔

اس طباعت کا جو نسخہ راقم سطور کے سامنے ہے وہ اس طباعت کے اور نسخوں سے بھی زیادہ قیمتی اور قابل قدر ہے۔ پیش نظر نسخہ کی متعدد خصوصیات میں سے جو اس کو اس طباعت بلکہ سنن ابوداؤد کے تمام مطبوعہ اور بعض قلمی نسخوں سے بھی ممتاز کرتی ہیں یہ ہیں کہ ہندوستان کے کئی بڑے اساتذہ اور ماہر علمائے حدیث نے تقریباً ۷۰ سال تک اسی نسخہ میں پڑھایا ہے۔ ان علما میں سے کئی علما اور اساتذہ کے اس پر کثیر افادات وحواشی یادداشتیں اور توضیحات رقم ہیں، اور غالباً کوئی صفحہ ان توضیحات وافادات سے خالی نہیں اس نسخہ کے متن، اعراب یا حاشیوں میں اگر کوئی فروگذاشت ہوگئی تھی تو اس نسخہ میں اس کی بھی تصحیح کی گئی ہے، جو اعراب بین السطور یا کوئی افادہ بے محل ہوگیا تھا اس کی بھی وضاحت ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ اس کے متن پر اول سے آخر تک نہایت صحت کے ساتھ تازہ اعراب لگائے گئے ہیں۔ بین السطور میں بھی افادات کا وسیع وکثیر اضافہ ہے۔ راقم سطور کا اس نسخہ کی مائیکرو فلم تیار کرانے کا ارادہ ہے، اگر نسخہ کا عکس جوں کا توں شائع ہوجائے تو یقین ہے کہ حدیث شریف کے شائقین اور طالب علموں کو اس سے بہت فائدہ ہوگا۔

<u>مولانا سے سرسید کا تلمذ:</u>

مولانا نوازش علی کا آج کل کچھ تذکرہ کیا جاتا ہے اور ان کی جو کسی قدر یاد باقی ہے وہ سرسید احمد کے مولانا سے نسبت تلمذ کی وجہ سے ہے۔ حالی نے سرسید احمد کی تعلیم اور استادوں کی جو تفصیل لکھی ہے اس میں مولانا نوازش علی کا نام بھی شامل ہے۔ حالی نے لکھا ہے کہ سرسید احمد نے ابتدائے عمر میں جو درسی کتابیں پڑھی تھیں وہ بہت بے توجہی اور لاپرواہی سے پڑھی تھیں، ان کو ملازمت کے زمانہ میں بالکل بھول گئے تھے۔ جب سرسید کا فتح پور سے دہلی تبادلہ ہوا تو دہلی کے اس قیام کے زمانہ میں سرسید احمد نے بچپن میں پڑھی ہوئی سب کتابیں مختلف استادوں سے دوبارہ پڑھیں اور تازہ کیں۔ انہی استادوں میں سے جن سے سرسید نے درسی کتب دہرائیں ایک استاد دہلی کے مشہور واعظ مولوی نوازش علی بھی تھے۔

مولانا نوازش علی سے سرسید احمد کے تلمذ کی یہ روایت حالی نے (اس وقت) دہلی کی جامع مسجد کے امام سید محمد صاحب کے حوالے سے نقل کی ہے اور حیات جاوید میں اس کا تین موقعوں پر علیحدہ حیثیت سے ذکر کیا ہے، ایک جگہ ہے:

> ''جس زمانہ میں سید صاحب دہلی سے رہتک بدل کر گئے ہیں میں بھی ان کے ساتھ گیا تھا۔ وہ صبح سے دس بجے تک مولوی نوازش علی صاحب سے جن کو دہلی سے ہمراہ لے گئے تھے سبق پڑھتے تھے، بیس بیس بائیس بائیس صفحے شرح جامی اور قطبی کے ہر روز پڑھ لیتے تھے''۔۲۲

دوسری جگہ تحریر ہے:

> ''جس زمانہ میں سرسید مولوی نوازش علی مرحوم سے دہلی میں پڑھتے تھے میر محمد مرحوم امام جامع مسجد دہلی بھی ان کے ساتھ پڑھتے تھے، وہ کہتے تھے کہ جب سرسید صاحب چند روز کے لیے قائم مقام صدرامین مقرر ہوکر رہتک جانے لگے تو......''۲۳

اور آغاز کتاب میں اس کا یوں ذکر آیا ہے:

> ''مولوی نوازش علی مرحوم جو دہلی میں مشہور واعظ تھے اور تمام درسی کتابیں پڑھاتے تھے، ان سے کچھ پچھلی پڑھائی کو تازہ کیا اور کچھ فقہ میں مثل قدوری، شرح وقایہ اور اصول فقہ میں شاشی، نورالانوار اور ایک آدھ اور کتاب پڑھی''۔۲۴

پچھلی سطور میں آچکا ہے کہ اگر مولانا نوازش علی کا سرسید کے اصرار پر رہتک کے سفر کی روایت درست ہے تو یہ سفر ۱۸۵۰ء (۱۲۶۶ھ) میں ہوا ہوگا، لیکن اگر غور کیا

جائے تو اس سفر کی واقفیت اور اس روایت کی صداقت پر کئی شبہات ہیں۔ حالی اور سر سید احمد کے تذکرہ نگاروں کا اس پر اتفاق ہے کہ سر سید احمد کا دو مرتبہ رہتک میں تقرر ہوا لیکن دونوں مرتبہ یہ تقرر اور سفر بالکل عارضی ملازمت پر وقتی طریقہ سے ہوا تھا۔ ایک مرتبہ رہتک کے صدر امین خلاف سرکاری تحقیقات کی وجہ سے ان کا کام سر سید احمد کو دے دیا گیا۔ دوسری مرتبہ بھی کچھ اسی طرح کی بات ہوئی تھی اور سر سید احمد کا ایک وقتی ضرورت سے رہتک جانا ہوا تھا۔ صدر امین کی ملازمت بھی بڑا عہدہ اور کثیر تنخواہ کی ملازمت نہیں تھی کہ اس میں طلبا کی ایک بڑی جماعت کے کھانے اور دوسرے اخراجات کا موقع نکل آتا اور یوں بھی کسی عارضی سفر کے وقت جس میں قیام کی مدت بہت کم ہو اور کسی معطل و برطرف ملازم کے ناکارہ کام کو سنبھالنا بھی ہو، درس وافادہ کے لیے وقت نکالنا آسان کام نہیں اگر چہ اس میں شک نہیں کہ سر سید احمد بہت ہی عالی ہمت اور نہایت محنتی انسان تھے، مگر پھر بھی بالکل عارضی ملازمت پر جاتے وقت جس کی قیام کا وقفہ بھی بہت مختصر تھا اس قدر اہتمام اور طلبا کے بڑے قافلہ کو ساتھ لے کر جانا سمجھ میں نہیں آتا۔

یہاں راقم سطور یہ کہنے کی جرات کرتا ہے کہ حالی نے کئی صحیح واقعات کو جان بوجھ کر چھپایا ہے اور بعض بے بنیاد باتوں کو تاریخ بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ روایت بھی شاید اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ سر سید احمد نے مولانا نور الحسن کاندھلوی سے باقاعدہ اور لمبے عرصہ تک پڑھا ہے، جس کا سر سید احمد نے اپنی کتابوں میں کئی جگہ تشکر کے ساتھ ذکر اور اعتراف کیا ہے۔ مگر حالی نے مولانا نور الحسن کاندھلوی سے تلمذ و تعلیم کی تمام روایات اور شہادتوں بلکہ خود سر سید احمد کی مطبوعہ تحریروں کو بھی نظر انداز کر کے ایک نئی ترتیب بنائی ہے لیکن اس کوشش اور سر سید احمد کی تعلیم و تربیت میں مولانا نور الحسن کی صحبت واثرات کو پوری طرح فراموش اور نظر انداز کرنے کے باوجود خود حالی نے ایک جگہ یہ لکھ گئے ہیں کہ:

"جس زمانہ میں وہ فتح پور سیکری میں منصف تھے اس وقت مولانا نور الحسن مرحوم آگرہ میں منصف تھے۔ سر سید کی ان سے نہایت گہری دوستی تھی مطالعہ کے وقت کتاب کے مشکل مقامات جو سمجھ میں نہ آتے تھے ان کے سمجھنے کے لیے ہر اتوار کو وہ گھوڑے پر سوار ہو کر فتح پور سے آگرہ میں مولانا کے پاس آتے تھے کئی برس تک بلا ناغہ ان کا یہی دستور رہا"۔ ۲۵

یہاں یہ وضاحت مناسب ہوگی کہ جب مولانا نور الحسن کاندھلوی آگرہ کالج میں عربی کے پروفیسر تھے اس وقت سر سید احمد مولانا سے غالباً عربی کی اعلیٰ درسیات میں استفادہ کر رہے ہوں گے، مولانا کی توجہ اور سر سید احمد کی لیاقت کا یہ اثر تھا کہ اسی زمانہ میں (بہ ظاہر مولانا نور الحسن کاندھلوی کی کوشش سے) سر سید احمد اس کالج کے ممتحن بنا دیئے گئے تھے۔ ۲۶

غور طلب بات یہ ہے کہ سر سید مولانا نور الحسن کاندھلوی سے کئی برس تک متواتر استفادہ کرتے رہے اس کے بعد اسی تلمذ کی وجہ سے اس اعلیٰ درجہ کے کالج کے ممتحن بھی بنا دیئے گئے جو امتحانات میں بھی نگرانی کرتے رہے اور متعلقہ درجات اور کلاسوں کے امتحانات کے پرچے بھی سر سید احمد ہی بناتے ہوں گے، اس لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ یہ اعلیٰ استعداد اور لیاقت و قابلیت فتح پور سیکری سے دہلی آتے آتے حالی کے الفاظ میں بالکل نسیا منسیا ہو[۲۷] ایسی ختم اور کالعدم ہوگئی ہو کہ دہلی آتے ہی تمام اسباق دوبارہ پڑھنے اور درسیات کی تجدید کی ضرورت پیش آگئی ہو۔ سر سید جیسے ذہین و فطین شخص سے یہ تو ممکن ہے کہ انھوں نے جو کتابیں پڑھی تھیں یا فنون ادب کی وہ تصانیف جو نصاب سے زائد تھیں اپنی سرکاری مصروفیات و ملازمت کے باوجود بڑے علما اور استادوں سے پڑھنے کا شوق رکھتے ہوں اور اس کے

لیے نظام الاوقات بنا رکھا ہو، لیکن علمی تصنیفی خدمات میں مشغولیت آگرہ کالج میں ممتحن کے لیے انتخاب اور اعلیٰ ترین علما اور اہل کمال سے ہر وقت رابطوں اور تعلقات کیے ہوئے وہ ابتدائی درسیات تک سے ناواقف ہوگئے ہوں، کیسے ہوسکتا ہے؟ سرسید احمد کے نظریات یا تعلیمی تحریک سے کسی کو اتفاق ہو یا اختلاف لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ سرسید احمد نہایت عالی دماغ شخص تھے، ایسا مسلمہ عالی دماغ شخص نوعمری میں پڑھی ہوئی درسی کتابوں کو بھول جاتا ہو اور ان کا بار بار اعادہ اور تکرار کرتا رہتا ہو، قابل قبول معلوم نہیں ہوتا۔

یہاں یہ بات بھی لائق توجہ اور قابل ذکر ہے کہ سرسید احمد کا ذوق ومزاج یہ ہے کہ وہ اپنے بزرگوں استادوں اور محسنین کا بار بار ذکر کرتے ہیں جس میں تشکر وممنونیت کا احساس صاف جھلکتا ہے، وہ جب کسی ایسے شیخ عالم یا طبیب وغیرہ کا تذکرہ کرتے ہیں جس کی ان پر شفقت و عنایت کی نگاہ تھی، ان سے خاص روابط تھے، گھریلو تعلقات تھے، ان سے دوستی یا مراسم تھے، ان سے کچھ پڑھا تھا تو سرسید احمد اس کا اہتمام سے ذکر کرتے ہیں۔ سرسید احمد کے مکتوبات وتحریرات کے علاوہ آثار الصنادید میں اس کا التزام ہے، آثار الصنادید میں بیس سے زائد ایسے اصحاب کا ذکر ہے جس میں ذاتی واقفیت کا ذکر اور کلمات تشکر و اعتراف درج ہیں، مگر مولانا نوازش علی کے تعارف میں ایسا کوئی لفظ موجود نہیں جس سے یہ تاثر ملتا ہو کہ سرسید کی مولانا سے بھی خاص واقفیت یا روابط تھے۔ تعلیم وتلمذ کا تو اشارہ تک نہیں۔ اگرچہ یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ حالی نے سرسید احمد کے سفر رہتک کے وقت مولانا کی سرسید کی رفاقت اور اس سفر میں تعلیم واستفادہ کی بات کی ہے لیکن حالی کی اطلاع اگر صحیح ہے تو مولانا نوازش علی سرسید احمد کی رہتک کے پہلے سفر میں سرسید کے ساتھ گئے ہوں گے۔ تاہم مولانا نوازش علی سے سرسید کے تلمذ کی روایت مشتبہ اور مزید معلومات کی متقاضی ہے۔

حالی نے مولانا نوازش علی سے سرسید کے تلمذ کا دہلی کی جامع مسجد کے امام (سید محمد امیر) کے حوالے سے ذکر کیا ہے[۲۸] حالاں کہ یہ بات ایسی نہیں تھی جس کے لیے حالی کو اتنی دور کے حوالہ کی ضرورت ہوتی۔ اگر مولانا نوازش علی سے سرسید کے تلمذ کی روایت درست ہے تو سرسید اور حالی کا اس حوالے سے ایک ذاتی تعلق ہونا چاہیے تھا، دونوں میں ایک دو مرتبہ نہیں بلکہ بار بار اس کا ذکر آنا چاہیے تھا کہ وہ ایک استاد کے شاگرد اور ایک سلسلہ علم کے وابستہ ہیں۔

حالی کی سرسید احمد سے تقریباً ۳۰ سال تک ملاقات، روابط اور خط وکتابت رہی۔ حالی کو سرسید احمد کی تعلیمی تحریک اور ان کی ذاتی زندگی سے دلچسپی تھی، حالی کے علی گڑھ کے سفر ہوتے رہتے تھے۔ دوسرے مقامات پر بھی سرسید سے ملاقاتیں رہتی ہوں گی، لیکن حیرت ہے کہ ۳۰ سالہ طویل ملاقات وروابط میں کبھی ایک مرتبہ بھی اس کا تذکرہ نہیں آیا کہ سرسید احمد مولانا نوازش علی کے بھی شاگرد ہیں اور حالی نے بھی معلوم نہیں کس وجہ سے یہ کہنا بھی مناسب نہ سمجھا کہ وہ بھی مولانا کے فیض کرم کے جرعہ نوش ہیں۔

اس دور میں اپنے استادوں کا جو احترام تھا اور دہلی کی تمام علمی ادبی اور خاندانی محفلوں میں ۱۸۵۷ء سے پہلے کی دہلی اور اس کے احوال وواقعات کا جو چرچہ رہتا تھا خصوصاً سرسید احمد کو قدیم دہلی اور اپنے استادوں سے جو محبت و عقیدت تھی، کیا اس نے کبھی سرسید کو آمادہ نہیں کیا ہوگا کہ وہ اپنی ذاتی مجلسوں میں مولانا نوازش علی کی نوازشات و عنایات کا ذکر کرتے، اور حالی جو خود بھی مولانا نوازش علی کے شاگرد تھے اس تذکرہ سے بے قرار نہ ہوجاتے اور دونوں اپنے زمانۂ تعلیم کی یادوں میں نہ کھو جاتے۔ اپنے استاد محترم کے کمالات، محبت وشفقت ان کے طریقۂ تعلیم، ان کی صحبت، علمی محفلوں اور اس کے اور پہلوؤں کا ذکر نہ کرتے۔

یہ ایک عام بات پرانا معمول اور روایت ہے کہ ایسے اصحاب جو کسی ایک استاد یا تعلیم گاہ سے وابستہ رہے ہوں جب کبھی ملتے ہیں تو اپنی تعلیم گاہ، خاص استادوں ان کے اخلاق صفات اور ان کے اپنی ذات پر خاص احسانات و اثرات کا تذکرہ ضرور کرتے ہیں، بلکہ اکثر یہی عنوان ان کی گفتگو کا خاص موضوع ہوتا ہے۔ کیا سرسید احمد نے ۳۰ سال کے لمبے عرصہ میں ایک مرتبہ بھی اپنے استادوں کو یاد نہ کیا ہوگا۔ سرسید احمد جب کبھی اپنی ملازمت کے سلسلوں میں سیر وسفر کا ذکر کرتے ہوں گے کیا اس میں رہتک کے سفر اور اس میں مولانا نوازش علی کی رفاقت کا ذکر نہ آیا ہوگا۔ اگر یہ سب نہیں ہوا جیسا کہ حالی کی تحریر سے واضح ہے تو اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ سرسید کا مولانا نوازش علی سے تلمذ کا رشتہ نہیں تھا۔

یہ بات بھی حیرت انگیز ہے کہ حالی نے حیات جاوید میں مولانا نوازش علی کا اس طرح ذکر کیا ہے جیسے حالی ان سے ناواقف ہوں۔ حالی نے مولانا کا صرف یہ تعارف کرایا ہے کہ وہ دہلی کے ایک واعظ تھے[۲۹] یعنی حالی ان کے مقام ومرتبہ اور احوال وکمالات سے واقف نہیں تھے حالاں کہ مولانا نوازش علی وہ شخص تھے جن کی خدمت میں حالی نے ڈیڑھ سال گزارے تھے۔ جب حالی اپنے محترم استاد اور مربی کے ساتھ یہ معاملہ کررہے تھے، معلوم نہیں ان کا ضمیر کیا کہتا ہوگا۔ اس میں کوئی کھٹک چبھن پیدا ہوئی تھی یا نہیں۔ کیا اس وقت حالی کو یاد نہیں آیا ہوگا کہ مولانا نوازش علی دہلی کے ایک معروف عالم اور مدرس تھے اور وہی میرے استاد اور مربی بھی ہیں۔ ان ہی کی صحبت کا فیضان ہے کہ میرا اہل علم میں شمار ہے۔ مولانا ہی مجھے علم کے راستہ پر ڈالنے والے ہیں۔ اگر حالی نے اپنے خودنوشت حالات میں مولانا نوازش علی صاحب کا ذکر نہ کیا ہوتا تو شاید کسی کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ مولانا نوازش علی حالی کے استاد تھے۔

مولانا کے ایک مشہور شاگرد الطاف حسین حالی اور حالی کا مولانا کے متعلق ناقابل فہم رویہ:

مولانا نوازش علی نے دہلی میں کم سے کم چودہ پندرہ سال تک پڑھایا ہے[۲۶] جس میں اس زمانہ کے علما کے مزاج ومعمول کے مطابق ادنیٰ سے اعلیٰ ترین تک تمام کتابیں اور درسیات شامل رہتی تھیں۔ ہر ایک طالب علم کو اس کی لیاقت اور علمی صلاحیت کے مطابق چھوٹی بڑی ادنیٰ سے اعلیٰ تک کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، اس بڑے اور گوناگوں قسم کے حلقۂ درس میں کس زمانہ میں کس قدر طالب علم مولانا سے پڑھتے رہے، مولانا کے تمام شاگردوں کی کیا تعداد یا اندازہ ہے اور بعد کے دور کے مشاہیر اور ممتاز اصحاب میں سے کس کس نے مولانا سے پڑھا تھا اس کا کوئی اجمالی اشارہ بھی میرے علم ودسترس میں نہیں ہے، لیکن مولانا سے تعلیم پاکر جو اصحاب علمی افق پر نمایاں ہوئے اور درجۂ کمال تک پہنچے اور برصغیر کی علمی تصنیفی دنیا میں ان کا بہت شہرہ اور امتیاز ہے ان میں ایک قابل ذکر نام حالی کا بھی ہے۔

الطاف حسین حالی (ولادت ۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء) نے فارسی کی چند کتابیں اور عربی صرف ونحو پانی پت میں پڑھی تھیں۔ مزید تعلیم کے شوق میں گھر والوں سے چھپ کر دہلی آگئے، دہلی پہنچ کر مولانا نوازش علی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے۔ مولانا سے صرف ونحو اور منطق فلسفہ کی متوسط سے اعلیٰ کتابوں تک پڑھا۔ مولانا سے تعلیم واستفادہ ڈیڑھ سال جاری رہا یعنی حالی ڈیڑھ سال مولانا کی خدمت میں حاضر رہے۔ ۱۸۵۵ء میں پانی پت واپس آگئے تھے۔

اگرچہ حالی نے اس کی صراحت نہیں کی لیکن قرین قیاس ہے کہ حالی مدرسہ حسین بخش میں یا مولانا کی مسجد میں رہتے ہوں گے اور ان کے کھانے کپڑے وغیرہ کا انتظام بھی مولانا ہی فرماتے ہوں گے، لیکن حالی کی احسان فراموشی

اور کمال ناقدردانی دیکھیے کہ وہ استادِ محترم کے لیے عقیدت و محبت کے الفاظ ان کی مجالس درس کے فیضان اور تعلیم و صحبت سے حاصل فوائد و کمالات کے احسانات کے تشکر اور ممنونیت کے جذبات و احساسات سے بالکل عاری اور یکسر آزاد ہو کر مولانا کا اس طرح ذکر کرتے ہیں جیسے حالی کی بعض جدید علوم سے ناواقفیت، دہلی کالج میں نہ پڑھنے اور متوقع ترقیات حاصل نہ ہونے کی ذمہ داری مولانا نوازش علی پر آتی ہو۔ حالی کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"دہلی پہنچ کر جس مدرسہ میں مجھ کو شب و روز رہنا پڑا وہاں سب مدرس و طلبا کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے۔ غرض کہ بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گزرا تھا، ڈیڑھ برس دہلی میں رہنا ہوا اس عرصہ میں کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں"۔ [۳۰]

اگر حالی دہلی قیام کے ڈیڑھ سال کے خاصے لمبے عرصہ میں کبھی دہلی کالج نہیں گئے تو اس میں مولانا نوازش علی یا ان کے مدرسہ کے طلبا کی کیا خطا ہے۔ حالی اگر مولانا نوازش علی کی مسجد (کوچہ چیلان یا مدرسہ حسین بخش) سے مرزا غالب کی رہائش گاہ (گلی قاسم جان، بلی ماران) تک جاسکتے تھے [۳۱] تو وہ تقریباً اسی قدر اور مسافت طے کر کے بلی ماران سے دہلی کالج (کشمیری گیٹ) بھی جاسکتے تھے۔ دہلی کالج، مدرسہ مولانا نوازش علی یا غالب کی رہائش گاہ سے ایسا دور نہیں تھا کہ وہاں جانے میں پریشانی ہوتی۔ دہلی کالج کے اکثر طالب علم پرانی دہلی کے محلوں سے تعلق رکھتے تھے وہ سب روزانہ کالج آتے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ کالج جانے میں کیا رکاوٹ تھی، کس نے منع کیا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حالی کو دہلی کالج، وہاں کے استادوں، شاگردوں، طلبا اور وہاں زیرِ تعلیم مضامین سے بھی کچھ مناسبت نہیں تھی یا ان کتابوں اور مدرسہ سے وحشت ہوگئی تھی یا یہ احساس کمتری تھا جس نے نہ اس مدرسہ سے مناسبت و محبت ہونے دی جس میں حالی رہتے اور پڑھتے تھے اور نہ دہلی کالج جانے دیا جو اس وقت دہلی کا ایک اعلیٰ درجہ کا مدرسہ اور مشہور درس گاہ تھی۔ ممکن ہے کہ یہ سب حالی کے طبیعت کی کسی اندرونی گرہ یا گھریلو مسئلہ کی وجہ سے ہو جو دہلی میں رہتے ہوئے بھی حالی کے حواس پر مسلط رہا۔ حالی کی یہ سطریں پڑھتے ہوئے ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کا وہ تاثر اور تبصرہ یاد آجاتا ہے جو انھوں نے مطالعہ حالی میں لکھا ہے کہ:

"ان کے مختصر دیوان کو دیکھ کر (خواجہ میر) درد کے دیوان کی یاد آتی ہے اعتدال و اختصار، لیا دیا پن دونوں کے یہاں ہے لیکن درد کے یہاں انسان اور دیوتا کا ایسا امتیاز ملتا ہے، درد کے یہاں انسانیت میں روحانیت کی ایسی جھلک ملتی ہے جو حالی کے یہاں مفقود ہے۔ حالی کا رُکا رُکا پن نہیں ہے۔ حالی کا پاکیزہ اور پاکیزہ سے زیادہ مہذب معیارِ عشق، نہ اس معیاری نیکی کا پتا دیتا ہے ان کی اس سپردگی اور خلوص کا، نہ اس طہارت قلب کا جس کا آئینہ دار درد کا کلام ہے۔ حالی کی شخصیت و شعور کے ہیر یا بطن (Core) میں کوئی سخت حصہ یا عنصر تھا جو حل ہونے سے رہ گیا تھا"۔ [۳۲]

سندیلوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ حالی کا:

"(حالی کا) کھل کے نہ بول سکنا اس امر کی چغلی کھاتا ہے کہ دل میں چور ہے"۔ [۳۳]

حالی کی تصریحات کے مطابق مولانا نوازش علی، سرسید اور حالی دونوں کے استاد تھے۔ حالی ان کی خدمت و صحبت میں متواتر ڈیڑھ سال رہے اور ان سے مسلسل استفادہ کیا۔ حالی جب مولانا کی خدمت میں رہتے تھے اس وقت انھوں نے مولانا کے نئے پرانے شاگردوں سے

مولانا کے متعلق بہت کچھ سنا ہوگا۔ مولانا کی تعلیم اور استادوں کی تفصیلات سامنے آتی ہوں گی۔ جس کا اس زمانہ میں بہت اہتمام رہتا تھا۔ مولانا کے زمانہ تعلیم کی سرگذشت اس مقصد کے لیے وطن سے دہلی یا اور مقامات کے سفر اور ان کے استادوں اور ان سے متعلقات کا ذکر اور پڑھانے کے زمانے کے متعدد واقعات بھی طلبا کی زبانوں پر رہتے ہوں گے اور مولانا کا دہلی کے علما اور علمی مجلسوں میں جو مقام ومرتبہ تھا اس کا بھی ذکر وتذکرہ رہتا ہوگا۔

حالی علم وصلاحیت سے محروم اور حافظہ ولیاقت کے کمزور نہیں تھے کہ ان کو ان باتوں کی طرف کچھ توجہ نہ ہوتی ہو یا یہ باتیں ان کے ذہن ویادداشت سے محو ہوگئی ہوں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حالی نے یہ سب جان بوجھ کر کیا ہے۔ غالباً حالی کو اپنے مستقبل کے متعلق کچھ ایسی امیدیں تھیں جن کا تصور یا نواب حالی کے ذہن پر لمبے عرصہ تک چھایا رہا۔ مگر وہ توقعات پوری نہیں ہوئیں تو حالی نے اس کا غصہ مولانا نوازش علی اور ان کے طریقۂ تعلیم پر نکالا ہے۔

حیات جاوید لکھتے وقت اس کا موقع اور پوری گنجائش تھی کہ حالی مولانا نوازش علی کے احوال وکمالات اور علمی تعلیمی اثرات کا تفصیل سے ذکر کرتے۔ مولانا نوازش علی اس دور میں دہلی کے علمی حلقوں میں جو مقام بنالیا تھا اور مولانا سے جو تعلیمی فیضان جاری تھا اس کے تمام پہلوؤں کو روشنی میں لاتے۔ حالی کا دینی اخلاقی فرض اور بڑی علمی ذمہ داری تھی کہ وہ اپنے اس بڑے استاد کے مفصل حالات لکھتے۔ مولانا کے شب وروز کی دیدہ وشنیدہ روداد قلم بند کرتے۔ مولانا نوازش علی کے استادوں اور شاگردوں کا جو تذکرہ دیکھا اور سنا تھا اس کی تفصیل ذکر کرتے۔ مولانا کے پاس کن اصحاب وعلما کا آنا جانا ہے ان کی نشاندہی کرتے، مولانا جن علما سے خاص روابط رکھتے تھے ان کا تعارف لکھتے اور خود حالی نے مولانا کے فیض صحبت سے جو کچھ حاصل کیا تھا اس کی من وعن داستان سناتے لیکن نہایت تعجب اور نہایت افسوس ہوتا ہے کہ حالی نے اس اہم شخصیت کو پوری طرح اور جان بوجھ کر نظرانداز کیا ہے بلکہ وہ مولانا کا اس طرح ذکر کرتے ہیں جس سے مولانا اور ان کے حلقۂ درس کی تنقیص ہوتی ہے۔ مولانا نوازش علی کے کمال، دینداری اور پوری زندگی کی دینی علمی خدمات پر معاصرین کی تحریریں اور دوسرے ذرائع شہادت دے رہے ہیں لیکن جو شاگرد مرتبہ کمال پر پہنچنے کے دعوے کے باوجود اپنے مخلص اور کامل الفن استادوں کی اس طرح توہین وتنقیص کرے اس کو کیا کہا جائے۔ یقیناً اس کے متعلق اچھی رائے نہیں دی جاسکتی۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حالی کا مولانا نوازش علی سے صرف تعلیم واستفادہ کا ہی رابطہ نہیں تھا بلکہ حالی نے مولانا کو اپنا مربی بھی تسلیم کررکھا تھا۔ اس زمانہ میں حالی جو کچھ لکھتے پڑھتے تھے اس کو مولانا کے ملاحظہ کے لیے پیش کرتے تھے اور اس کے متعلق مولانا کی جو رائے یا مشورہ ہوتا اس پر عمل کرتے تھے۔ اسی زمانۂ تعلیم میں حالی نے اپنی ایک مختصر تالیف جس میں وہابی علما کی تائید کی گئی تھی مولانا نوازش علی کی خدمت میں پیش کی۔ مولانا نے اس تالیف اور مرتب کی لیاقت کی تعریف کی مگر اس کے عام ہونے کو پسند نہیں کیا۔ مولانا کی اس رائے یا مشورہ کی تعمیل میں حالی نے اپنی اس کتاب کو ضائع کردیا تھا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''غدر سے دو تین سال قبل زمانۂ طالب علمی میں حالی نے دہلی میں ایک رسالہ نواب صدیق حسن خاں کی تائید میں لکھا تھا، ان کے استاد نے جو مشہور حنفی عالم تھے اور حسین بخش کے مدرسہ میں پڑھاتے تھے کہا کہ یہ رسالہ نہایت لیاقت سے لکھا گیا تھا مگر ایک وہابی مولوی کی تائید تھی اس لیے

چاک کردیا گیا''۔ ۳۴

میرا خیال یہ ہے کہ چوں کہ مولانا نوازش علی صاحب کا دہلی کے مشہور علما اور واعظوں میں شمار تھا اور وہ ۱۸۵۷ء میں تحریکِ آزادی میں سرگرم رہے اس میں مجاہدانہ قائدانہ شریک ہوئے جس کے نتیجہ میں ہندوستان سے ترک وطن کر کے حجاز حاضر ہوئے، یہ جرم ایسا نہیں تھا جس کو مغربی استعمار کے نمائندے اور دہلی کے انگریز افسران بھلا سکتے اور معاف کردیتے، اس لیے حالی مولانا کے تذکرہ میں احتیاط کرتے ہیں اور یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتے ہیں کہ میرا مولانا سے ایسا قریبی نیازمندانہ رابطہ رہا اور میری تعلیم و تربیت اور علمی صلاحیت کی ترقی میں مولانا کا خاص حصہ ہے، یہی کمزوری ہے جس کی وجہ سے وہ مولانا کو تقریباً نظرانداز کرتے ہیں:

مولانا نوازش علی دہلوی اور مولانا نوازش علی رامپوری دو علیحدہ شخص ہیں:

مولانا نوازش علی دہلوی کے تعارف میں بعض اہل علم نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ مولانا رام پور میں بھی رہے تھے اور ان کے فرائض (میراث) کے موضوع پر فارسی میں ایک مختصر تالیف یا رسالہ بھی تھا۔ یہ اطلاع عموماً تذکرہ کاملانِ رام پور سے لی گئی ہے۔ کاملان رام پور کا مآخذ مولانا عبدالقادر رام پوری کی آپ بیتی (یا سفر نامہ) وقائع عبدالقادر فانی ہے، مگر وہاں اس اطلاع کا حوالہ دینے میں سہو ہوا۔ عبدالقادر رامپوری اور احمد علی شوق مولانا نوازش علی رام پوری کے نام سے جس عالم کا تذکرہ کرتے ہیں وہ دوسرے شخص ہیں۔ ان کا مولانا نوازش علی دہلوی سے کچھ نسبت اور رابطہ و تعلق نہیں۔ اس کی تصدیق خود عبدالقادر چیف کی تحریر سے ہورہی ہے۔ عبدالقادر رامپوری نے لکھا ہے کہ:

> ''(مولوی نوازش علی) علم فرائض میں شہرۂ آفاق تھے اس فن میں ایک رسالہ منظوم بزبان فارسی ان کی یادگار ہے''۔ ۳۵

اس سے صاف واضح ہے کہ وہ مولانا نوازش علی جو شہرہ آفاق تھے اور فرائض پر ایک رسالہ ان کی یادگار ہے، وقائع عبدالقادر کی تالیف ۱۲۴۶ھ۔ ۱۲۴۵ھ (۱۸۳۱ء) سے برسوں پہلے انتقال کر چکے تھے۔ مولانا نوازش علی دہلوی اس وقت نوجوان تھے، دہلی میں پڑھ رہے تھے اور بہت ممکن ہے کہ مولانا نوازش علی دہلوی مولانا رامپوری کے زمانۂ حیات میں پیدا بھی نہ ہوئے ہوں۔ اس لیے مولانا نوازش علی رام پوری اور مولانا نوازش علی دہلوی کو ایک سمجھنا درست نہیں۔

☆☆☆

مصادر و مراجع

ا ملاحظہ ہو حاشیہ مقالات سرسید، مرتبہ: شیخ اسماعیل پانی پتی، جلد: ۱۶، صفحہ: ۳۵۳ (لاہور، ۱۹۶۵ء)
اس اطلاع کی ۱۸۵۷ء کی جنگ کے درمیان دہلی میں موجود انگریزوں کے ایک مخبر گوری شنکر کی تحریر سے تصدیق ہورہی ہے گوری شنکر نے جو مولانا کا معاصر تھا، اور بہ ظاہر مولانا کو ذاتی طور پر جانتا بھی تھا، یہی لکھا ہے کہ:
''تھانیسر کے ایک گاؤں ہبری کا باشندہ'' اس گھر کو آگ لگ گئی.........
مرتبہ: عاشور کاظمی، وسلیم قریشی صاحبان، دہلی، ۱۹۹۳ء، صفحہ: ۱۸۷۔ دوسرے ایڈیشن میں ''اس گھر کو آگ لگ گئی......'' کا نام بدل کر ''غداروں کے خطوط'' کردیا ہے۔

۲ آثار الصنادید، الف: باب چہارم، (طبع اول، دہلی، ۱۲۶۳ھ، ۱۸۴۷ء) صفحہ: ۳۱۔ ب: مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم، جلد: دوم، صفحہ: ۲۷۸، دہلی، ۱۹۹۲ء)

۳ آثار الصنادید، مرتبہ: خلیق انجم، جلد: دوم، صفحہ: ۲۷۸، (دہلی، ۱۹۹۲ء)
۴ حالات مولانا محمد قاسم، مؤلفہ: مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مرتبہ: نور الحسن راشد کاندھلوی، (مشمولہ: قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی احوال وآثار باقیات ومتعلقات، صفحہ: ۱۷۹، (کاندھلہ: ۱۴۲۱ھ۔۲۰۰۰ء)
۵ مدرسہ حسین بخش، ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۲ء) میں قائم ہوا تھا، مدرسہ کی پیشانی پر اس کا تاریخی نام ''دارالہدی والوعظ'' کندہ ہے۔ جس سے ۱۲۶۸ھ نکلتا ہے۔ اس لیے یہ اطلاع صحیح نہیں کہ اس مدرسہ سے مولانا مملوک العلی بھی وابستہ رہے ہیں، یا حضرت مولانا نے اس میں پڑھایا ہے۔ اس مدرسہ کے قیام سے ایک سال پہلے مولانا کی وفات ہوگئی تھی۔
۶ خاتمۃ الطبع، سنن ابوداؤد، صفحہ: ۲۶۳، (مطبوعہ دہلی: ۱۲۷۲ھ) اس نسخہ کا تعارف آئندہ سطور میں آرہا ہے۔
۷ آثار الصنادید (طبع اول) باب چہارم، صفحہ: ۱۳۱، (ب) مرتبہ: خلیق انجم، جلد: دوم، صفحہ: ۱۱۸
۸ حالی کی کہانی حالی کی زبانی، مطبوعہ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ۔ جلد: ۱۹، شمارہ، ۵، مئی ۱۹۲۷ء۔
۹ بڑوٹ گوری شنکر مجر، اس گھر کو آگ لگ گئی، (دہلی)
۱۰ سید محمد دہلوی مخدوم جہانیان جہاں گشت سید جلال بخاری کی اولاد میں مشہور اور معزز بزرگ گزرے ۱۸۲۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے خاندانی روایت کے مطابق والد کی وفات کے بعد جامع مسجد دہلی کے امام مقرر ہوئے۔ ۷۱ برس کی عمر میں ۱۱/اگست ۱۸۹۹ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔ شاہ ولی اللہ کے خاندانی مدفن مہندیان میں دفن کیے گئے۔ مستفاد از تعارف بر مکتوبات سرسید بنام مولانا سید محمد، مکتوبات سرسید مرتبہ: شیخ اسماعیل پانی پتی، جلد: ۲، صفحہ: ۴، (لاہور: ۱۹۸۵ء)
۱۱ حیات جاوید، جلد: دوم، صفحہ: ۴۰۸، (دہلی: ۱۹۳۹)
۱۲ حیات جاوید، جلد: دوم، صفحہ: ۴۳۰، (دہلی: ۱۹۳۹ء)
۱۳ اس فتوے کی نقل اخبار الظفر دہلی نے چھاپی تھی اس کا عکس عبدالرزاق قریشی کی کتاب نوائے آزادی (بمبئی ۱۹۵۷ء) میں شامل ہے۔ صفحہ: ۹۔۸
۱۴ اس گھر کو آگ لگ گئی .... صفحہ: ۱۸۷، (دہلی: ۱۹۹۳ء)
۱۵ روزنامچہ ایام غدر، دہلی (قلمی) نقل آفتاب عالمتاب آگرہ۔ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔ مذکورہ بالا اقتباس مولانا فیصل احمد صاحب بھٹکلی ندوی کے تعاون سے حاصل ہوا۔ شکریہ۔
۱۶ الف: ابقاء المنن (آپ بیتی نواب صدیق حسن خاں) تسہیل از مولانا خالد سیف، صفحہ: ۴۶، (لاہور، ۱۴۰۷ھ۔۱۹۸۶ء)
ب: الروض الخصیب من تزکیۃ القلب المنیب، تالیف: نواب صدیق حسن خاں، صفحہ: ۱۶۳، (مطبع مفید عام اکبرآباد، آگرہ، ۱۲۹۸ھ)
۱۷ الروض الممطور فی تراجم علمائے شرح الصدور، صفحہ: ۲۲۲ (مطبع مفید عام، اکبرآباد، آگرہ، ۱۳۰۷ھ)
۱۸۔۱۹ خاتمۃ الطبع سنن ابوداؤد، مطبع قادری، دہلی، شعبان ۱۲۷۲ھ (اپریل، مئی ۱۸۵۶ء)
۲۰۔۲۱ خاتمۃ الطبع سنن ابوداؤد، مطبع قادری، دہلی، شعبان ۱۲۷۲ھ (اپریل، مئی ۱۸۵۶ء)

۲۲ حیات جاوید، مولانا الطاف حسین حالی، جلد: دوم، صفحہ: ۴۰۸، (دہلی: ۱۹۳۹ء)

۲۳ حیات جاوید، مولانا الطاف حسین حالی، جلد: دوم، صفحہ: ۴۵۰، (دہلی: ۱۹۳۹ء)

۲۴ حیات جاوید، مولانا الطاف حسین حالی، جلد: دوم، صفحہ: ۴۵، (دہلی: ۱۹۳۹ء)

۲۵ حیات جاوید، مولانا الطاف حسین حالی، صفحہ: ۴۰۴، (دہلی: ۱۹۳۹ء)

۲۶ سرسید احمد خاں فکر اسلامی کی تعبیر نو، تالیف: سی، ڈبلیو، ٹرول، مترجمین: قاضی افضل حسین، محمد اکرام چغتائی، صفحہ: ۸۶، لاہور، ۱۹۹۸ء

۲۷ حیات جاوید، مولانا الطاف حسین حالی، حصہ اول، صفحہ: ۴۸، (دہلی: ۱۹۳۹ء)

۲۸ حیات جاوید، مولانا الطاف حسین حالی، حصہ دوم، صفحہ: ۴۰۸۔۴۵۱، (انجمن ترقی اردو، دہلی: ۱۹۳۹ء)

۲۹ حیات جاوید، مولانا الطاف حسین حالی، حصہ اول، صفحہ: ۴۶، (دہلی: ۱۹۳۹ء)

۳۰ حالی کی کہانی خود ان کی زبانی۔ حالی کے یہ خود نوشت حالات حالی کے قلم سے نواب عماد الملک بلگرامی کی وفات کے بعد ان کے کتب خانہ میں ملے تھے جو پہلی مرتبہ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، جلد: ۱۹، شمارہ: ۵ (مئی ۱۹۲۷ء میں چھپے تھے۔ بعد میں حالی پر لکھی گئی کئی کتابوں اور خاص نمبروں میں بھی شائع ہوئے۔ معارف کا اصل شمارہ راقم کے سامنے ہے۔

۳۱ حالی نے لکھا ہے کہ ''جس زمانہ میں میرا دہلی جانا ہوا مرزا غالب کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا''۔ حالی کی کہانی خود ان کی زبانی'' نیز ملاحظہ ہو، یادگارِ غالب۔ حالی۔

۳۲ مطالعۂ حالی، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، صفحہ: ۶۷، (لکھنؤ ۱۹۵۶ء)

۳۳ مطالعۂ حالی، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، صفحہ: ۶۹، (لکھنؤ ۱۹۵۶ء)

۳۴ سہ ماہی فکر و نظر، حالی نمبر، صفحہ ۱۲۱، (علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۹۱ء)

۳۵ وقائع عبد القادر خانی، بحواشی محمد ایوب قادری، حصہ اول، صفحہ: ۷۸، (کراچی: طبع دوم، ۱۹۷۰ء)

☆☆☆

تہذیب الاخلاق

دسمبر ۲۰۰۳ء

2004

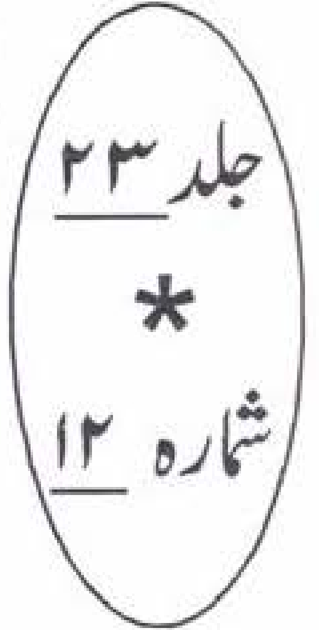
SARFRAZ

ادارۂ تہذیب الاخلاق و نشاۃ ثانیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

10/-







بانی

سرسید احمد خاں

مدیر

پروفیسر ابوالکلام قاسمی

شریک مدیر:

ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی

نائب مدیر:

احمد مجتبیٰ قریشی

فی شمارہ	=/10 روپے	زرسالانہ	=/100 روپے	زرسالانہ طلبا	=/80 روپے
بیرونی ممالک (ہوائی ڈاک)	30$ امریکی ڈالر	بیرونی ممالک (عام ڈاک)	15$ امریکی ڈالر		
لائف ممبرشپ (اندرون ملک)	=/1000 روپے	لائف ممبرشپ (بیرون ملک)	300$ امریکی ڈالر		

ترسیل زر کا پتہ

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق ونشانت

۱- شبلی روڈ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ - یوپی (انڈیا) ۲۰۲۰۰۲ - فون: ۲۷۰۳۰۲۷ (۰۵۷۱)

ترتیب

سرورق　　　تزئین　　　سرفراز

ایڈیٹر پبلشر پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس کے توسط سے چھپوا کر ادارہ تہذیب الاخلاق ونشانت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع کیا۔